پاکستانی ثقافت کی بعض منفرد خصوصیات

رواں دواں

*****

احمد ندیم قاسمی

پاکستان کے مختلف علاقوں کی اپنی اپنی ثقافتی خوبصورتیاں ہیں۔ ان میں سے بیشتر مشترک ہیں اور اشتراک سے قومی کلچر صورت پذیر ہوتا ہے۔ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے مختلف علاقوں کی ثقافتی خوبصورتیوں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ دراصل مجموعی قومی کلچر ملک کے عوام الناس کے باہمی میل جول، ان کے رسم ورواج سے آشنائی، ان کی زبانوں میں شعروادب کے حسن سے تعارف سے اجتماعی صورت اختیار کرتا ہے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ سیاستدانوں نے اپنے اپنے مفادات کی خاطر ملک کے مختلف علاقوں کے عوام کے ذہنوں میں تعصب بھر دیا ہے اور قومی ثقافت کی فیصلہ کن صورت پذیری میں ارباب سیاست کی عاقبت نااندیشانہ سرگرمیاں بری طرح حائل ہیں۔ میں نے ہمیشہ عرض کیا ہے کہ اگر ہمارا کوئی حکمران خوداعتمادی سے کام لے کر ملک کے استحصالی عناصر کو حتمی طور پر آپے میں رہنے کا فیصلہ کن سبق سکھا سکے اور اسی سلسلے میں بڑی بڑی زمینداریوں، وڈیروں کی حد نظر تک پھیلی مقبوضہ زمینوں، ملکوں اور چودھریوں کی جاگیردارانہ ذہنیتوں، خانوں اور سرداروں کی صدیوں پرانی عوام دشمنی کی روایات کو یک قلم ختم کردے تو پورے ملک کے عوام الناس کے درمیان یکجہتی اور ہم آہنگی کا معجزہ رونما ہوسکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے نئے وزیراعظم صاحب نے اقتدار میں آنے کے بعد اپنی پہلی ہی تقریر میں یہ فیصلہ کن اعلان کیا تھا کہ زرعی اصلاحات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود غربت وافلاس کو ختم یا کم کرنے کی کوششوں کا ذکر بھی ہو رہا ہے مگر استحصال کی بنیادی جڑ کے خاتمے کے بغیر غربت وافلاس کے خاتمے کی مہم ایسی ہی ہے جیسے کسی زار زار رونے والے کو آنسو پونچھنے کے لئے خالص ریشم کا رومال پیش کردیا جائے۔

بہرحال ہمارے ہاں کی ثقافتی خوبصورتیاں اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ یہ ثقافت سندھی بھائیوں کی ہو یا پٹھان اور بلوچ دوستوں کی یا پنجابیوں کی ہر حال میں تحفظ اور پھیلاؤ اور ایک دوسرے کی ثقافتوں میں آمیخت ہوجانے کی مستحق ہے۔

آج میں قارئین کرام کی خدمت میں اپنے علاقے سون سکیسر (ضلع خوشاب) کی ثقافتی انفرادیت کی چند تصویریں دکھانا چاہتا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس ثقافتی انفرادیت سے ملی جلی صورتیں ملک کے دوسرے حصوں میں بھی یقیناً موجود ہوں گی۔

یہ 1946ء کا واقعہ ہے جب جنوبی ایشیا میں تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یوپی) کے نوجوان طلبہ کا ایک وفد علاقہ سون میں بطور خاص اس لئے وارد ہوا کہ سالہا سال سے وہاں نوانہ لوگ قابض تھے۔ وہ ہر الیکشن میں وہاں سے ووٹ سمیٹ کر لے جاتے تھے اور بھول جاتے تھے کہ:

کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

نوجوان علیگیوں کا یہ وفد یکا یک میرے گاؤں انگہ میں وارد ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ نوجوان پورے گاؤں کے ہر فرد کے عزیز مہمان ہیں۔ میرے خالہ زاد بزرگ بھائی مولانا غلام مرشد (سابق خطیب مسجد شاہی، لاہور) کے مکان کی ایک لمبی چوڑی بیٹھک تھی۔ ہم طلبہ کو وہاں لے گئے اور پھر خود یہ نوجوان بھی دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دیہاتی نوجوان (چارپائیاں نہیں) رنگین پایوں کے پلنگ پر پلنگ اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ سرما کا موسم تھا اس لئے خوبصورت رضائیوں اور تکیوں کے بھی ڈھیر لگ گئے اور جب صبح ہوئی تو گاؤں بھر نے اجتماعی طور پر ان نوجوانوں کے ناشتے کا تسلی بخش اہتمام کیا۔ بعد میں وہ گاؤں کے ایک خشک تالاب کے کنارے کھڑے ہوکر سامنے بیٹھے ہوئے سینکڑوں کے مجمعے کو اردو میں مخاطب کرتے رہے مگر جب بھی پاکستان یا قائداعظمؒ کا لفظ ان کی زبان سے نکلا پورا ہجوم فلک شگاف نعرے لگاتا رہا۔ انگہ سے روانہ ہونے تک یہ نوجوان اس حیرت اور مسرت کا اظہار کرتے رہے کہ یہاں کی ثقافت کیسی پیاری ہے جو اجنبیوں کو بھی سینے سے لگا لیتی ہے اور ان کی بھرپور مدارات کرتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے کسی کو بھی ان معزز مہمانوں کی مدارات کی تلقین نہیں کی تھی جو کچھ ہوا تھا بے ساختہ ہوا تھا اور ثقافت کا یہی حسن ہے جو پورے ملک کے دیہات میں رائج ہے مگر اس حسن کو سمیٹنے والا کوئی نہیں۔

آج بھی ان دیہات میں یہ ثقافتی چلن رائج ہے کہ اگر گاؤں کے کسی گھر میں کسی کی وفات ہوگئی ہو تو نقارے پر اس حادثے کا اعلان کردیا جاتا ہے۔ تب تنوروں پر روٹیاں لگوانے والی عورتیں اپنا اپنا آٹا سمیٹ کر اپنے گھروں کی راہ لیتی ہیں اور تنوروں کی آگ بجھا دی جاتی ہے۔ گھروں کے چولہے بھی ٹھنڈے کردیئے جاتے ہیں۔ پہاڑی دیہات میں میت کو دفنانے کے لئے پتھروں کی لمبی لمبی سلوں کی ضرورت پڑتی ہے چنانچہ درجنوں نوجوان کسی طرف سے مشورہ ملے بغیر از خود دیہات سے نکل کر پہاڑوں کی راہ لیتے ہیں اور پتھر کی لمبی لمبی سلیں اٹھائے قبرستان میں جمع ہونے لگتے ہیں اور یہ سب کچھ بھی بے ساختگی سے ہوتا ہے کہ یہ وہاں کی ثقافتی روایت ہے!

آج بھی ان دیہات میں اگر گلی میں سے گزرنے والا دیکھتا ہے کہ سامنے سے کوئی برقعہ پوش یا چادر پوش خاتون آرہی ہے تو وہ وہیں رک جاتا ہے اور دیوار کی طرف رخ کرکے کھڑا ہوجاتا ہے اور جب یہ خواتین آگے نکل جاتی ہیں تو دیوار سے چمٹے ہوئے یہ ثقافتی اصولوں کے پروانے ہٹ کر اپنے کام پر روانہ ہوجاتے ہیں۔

یہ ثقافتی حسن دیہات کی انفرادیت سہی مگر بڑے بڑے شہروں میں بھی بعض ثقافتی مناظر غیرملکیوں کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ میں روزنامہ ''امروز'' کا ایڈیٹر تھا جب میرے دفتر میں ایک یورپین داخل ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اقوام متحدہ کے ادارے ''یونیسکو'' کا نمائندہ ہے اور پاکستان میں افسانے اور ڈرامے پر تحقیق کرنے آیا ہے۔ فرانس سے روانہ ہوتے وقت اسے لاہور کے چند اہل قلم کے نام دیئے گئے تھے۔ مجھ سے اس نے افسانے اور ڈرامے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد مولانا صلاح الدین احمد مدیر رسالہ ''ادبی دنیا'' سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں اسے ساتھ لے کر دفتر سے نکلا۔ اس زمانے میں لاہور ٹیکسیوں اور رکشاؤں سے محروم تھا۔ یہاں سڑکوں پر صرف تانگے چلتے تھے۔ میں نے اس مہمان کو تانگے میں بٹھا کر مال روڈ کا رخ کیا کہ ''ادبی دنیا'' کا دفتر مال روڈ پر تھا۔ وہ کسی مسئلے پر مجھ سے گفتگو کررہا تھا جب یکا یک کوچوان نے تانگہ روک لیا اور ایک طرف جا کر کھڑا ہوگیا۔ میرے مہمان نے حیرت سے اس کا سبب پوچھا تو میں نے اس سے کہا کہ سامنے نظر دوڑایئے۔ تانگے رک گئے ہیں، سائیکل چلانے والے اتر کر کھڑے ہوگئے ہیں، پیدل چلنے والے بھی رک گئے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ایک جنازہ جارہا ہے اور ہمارے ہاں میت کا بے حد احترام ہوتا ہے چنانچہ یہ ساری مخلوق اس نامعلوم مرنے والے کے احترام میں ساکت ہوکر رہ گئی ہے۔

میرے اس یورپی مہمان کی حیرت قابل دید تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ آپ کے ملک کی ثقافت کا کتنا خوبصورت پہلو ہے۔ ہمارے ہاں تو میت کو گاڑی میں رکھ کر قبرستان لے جاتے ہیں اور کسی کو کانوں کان پتہ ہی نہیں چلتا کہ ایک انسان اس جہان سے رخصت ہوگیا۔ میں تو واپس پیرس جا کر پاکستان کی اس ثقافتی انفرادیت پر مقالہ لکھوں گا۔

وہ مقالہ لکھا گیا یا نہیں میں اس بارے میں بے خبر ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ہماری ثقافت کے کتنے خوبصورت پہلو ہیں جو اب تک ثقافت کے موضوع پر کام کرنے والوں تک کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔